ورق ورق

از
(ظ، انصاری صاحب)

مولوی یہ حجۃ العلما چھاپ کے مولوی،
یہ "درس نظامی" حفظ کئے موئے مولوی،
جنہوں نے سات دریا، سات پہاڑ اور سات ملکوں تک جغرافیہ پڑھا ہے۔
اور ستر ہزار حور و غلماں کی جمع تقسیم تک حساب سیکھا ہے۔
اور خلافت عباسیہ تک تاریخ عالم یاد کی ہے۔
یہ نرے مولوی۔
جنہوں نے قائد اعظم کے صیغۂ نکاح اور رسم ختنہ تک ریسرچ کی ہے۔

میرے دوستو،
تم انہیں حقیر سے نہ دیکھو۔
میں انہیں فرقہ پرستی اور ڈھل مل یقینی کے طوفان میں چٹان کی طرح ثابت قدم پا چکا ہوں۔
ان کے عمل میں "صراطِ مستقیم" کی سی سیدھ رہ چکی ہے۔
اور "حبل المتین" کی سی استقامت۔
یہ ان موقع پرست اور دغاباز ماہرین سیاست سے ہزار درجہ لائق احترام ہیں۔
جن کی قانون دانی اور سیاست فہمی۔
ان کے گلے میں رسیاں ڈالے ہوئے سامراج کی آغوش میں لے گئی۔

جنہوں نے پیشہ ور وکیلوں کی طرح خطابت کے زور سے۔
جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھایا۔
جنہوں نے تاریخ دانی اور ریسرچ کی قوت سے۔
تہذیبوں کو تہذیبوں کے خلاف صف آرا کر دیا۔
اور پودوں کو ان کی جڑوں سے اکھاڑ دیا۔

او کھدر میں ڈھکے ہوتے ہاجن۔
تو مولوی کو کس منہ سے طعنہ دے گا؟
جب تو سودیشی کی تحریک میں نلکیاں لگائے اپنے ملوں کی کھیتی سیراب کر رہا تھا۔
اس وقت یہی مولوی۔
اپنے بھوکے بچوں سے دامن چھڑا کر
سامراجی آقائی کا گریباں پکڑنے جا رہا تھا۔
او انگریز کے اصطبل میں پلے ہوئے خچر
تو مولوی کو کس زبان سے فرقہ پرست کہتا ہے۔
جب تو اپنے آقاؤں کے اشارے پر
بھائی کو بھائی سے لڑواتا تھا۔
اس وقت یہی مولوی جامع مسجد کے منبر سے گاندھی جی کی تقریریں کراتا تھا۔

اے زہر کو احار بنا کر بیچنے والے بیوپاریو۔
تم مولوی کی وطن دوستی کا کیا کھاتا لکھتے ہو۔
شرم سے ڈوب مرو بدبختو،

جب تم دیش بھگتی کے خون سے فاشت ذہنیت کی جڑوں کو کھاد دے رہے تھے۔

اس وقت یہی مولوی تھا۔

جو اپنے آزاد روقار کی جڑوں پر،

(دیش بھگتی کے صلے میں) ہم مذہب فاشتوں کا کلہاڑا چلتے دیکھ رہا تھا۔

اے میرے اشتراکی بھائیو،

مولوی کو تحقیر سے نہ دیکھو۔

جب ہم پاکستان کے مطالبہ میں "حق خود اختیاری" کا جواز دیکھ رہے تھے۔

تو یہی مولوی تھا

جو "حق خود اختیاری" اور پاکستان میں فرق تلاش کر رہا تھا۔

جو پوچھتا تھا

"ہم پاکستان تو مان لیں مگر یہ کیسے ملے گا عام مسلمانوں کو یا خان بہادروں کو؟"

بھائیو یہ ہندوستان کا مولوی۔

بخارا اور شور بازار کا مولوی نہیں ہے۔

ہندوستان کا مولوی

قومی آزادی کی جنگ میں اپنا جان و مال دے چکا ہے

اس کے کاندھوں پر جنگ آزادی کی روایات کا بار ہے۔

اس کے جسم میں جمال الدین افغانی کے لہو کی حرارت ہے۔

وہ حرارت جس سے چنگاریاں جنم پاتی ہیں۔

محرم کی آج پہلی تاریخ ہے۔

اب دس دن تک امام حسینؓ کی یاد تازہ کی جائے گی۔

بعض وہ لوگ بھی اس میں شریک ہوں گے جو حسینؓ کو امام نہیں مانتے۔
وہ بھی شریک ہوں گے جو اسلام کو سچا مذہب نہیں سمجھتے۔
وہ بھی شریک ہوں گے جو ان عقائد کو مانتے ہیں جنہیں اسلام توڑنے آیا۔
اور بعض ایسے لوگ بھی جن کی زندگی حسینؓ کے مشن کی مخالفت پر بسر ہوتی ہے۔
حسینؓ ان خوش نصیب شہیدوں میں ہیں کہ ان کی یاد تیرہ سو سات برس سے منائی جارہی ہے۔
میں سوچتا ہوں کہ اس کا راز کیا ہے۔

حسینؓ کی شہادت اسلام کی تاریخ کا بڑا واقعہ ہے۔
لیکن میلاد النبی یا اعلانِ نبوّت سے زیادہ اہم تو نہیں ہے۔
پھر اس کی یادگار میں یہ اس درجہ ہمہ گیری کیوں چلی آرہی ہے؟
کیا اس لئے کہ انسانی سماج صدیوں سے مظلوم چلا آرہا ہے۔
اور مظلوم کو مظلوم سے ہمدردی ہوتی ہے۔
مگر یہاں تو ظالموں کو بھی، میں دیکھتا ہوں کہ حسینؓ کی یادگار منانے میں آگے آگے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ اس کا راز کھلا ہوا ہے۔
اس کا راز ہے وہ تام جھام، وہ میلہ اور جھمیلا جو محرم کے دنوں سے وابستہ ہوگیا ہے۔
مجلسیں۔ تبرک، نوحے، سوز، ماتم، جھولا، ذوالجناح، تابوت، تعزیہ سبیلیں اور جشن

دنیا میں کئی مذہب ایسے آئے جنہوں نے رائج الوقت "مائی تھولوجی" (صنمیات) پر حملہ کیا۔
بدھ اور مہاویر سے لے کر محمد عربیؐ تک۔
یہ لوگ اپنے زمانے کی بت پرستی اور اس کی افسانہ تراشیوں اور رسوم سے بے زار تھے۔

مہاویر تو اتنے بیزار تھے کہ انھوں نے خدا کے وجود سے ہی انکار کر دیا۔

لیکن انجام؟

انجام یہ کہ اب سب کے پاس بُت گری کی الگ الگ شکلیں موجود ہیں۔

اسلام نے بت گری اور اس کی افسانہ تراشی اور تمام جھام کا سخت مقابلہ کیا تھا۔

ایسا سخت مقابلہ کہ دشمن کے خیمے کی طنابیں تک کاٹ ڈالیں۔

غِنا، رقص، موسیقی اور مصوری سب حرام۔

لیکن انجام؟

انجام یہ کہ غِنا اور موسیقی نے سوز اور نوحے کی صورتیں نکال لیں۔

رقص نے ماتم کا روپ دھار لیا۔

مصوری نے تابوت، ذوی الجناح اور عَلَم پر کمالِ فن دکھا دیا۔

اور واقعۂ کربلا کی داستان مہابھارت کے افسانے سے زیادہ دلچسپ بن گئی،

اور اسلام نے اپنی "مائی تھولوجی" کا ایک باب اور کھولا۔

ستّر ہزار حوروں اور زمرّد کے ستّر ہزار محلوں میں وہ کشش نہیں ہے جو یہاں ہے

سوا نیزے پر آفتاب اور بال سے باریک پل صراط میں وہ عبرت نہیں جو یہاں ہے

اب بے چارے بت کیا طعنہ دیں گے کہ اسلام بالکل "خُشکا" ہے۔

اسلام کے پاس تو بڑھتے بڑھتے "مائی تھولوجی" کا حیرت انگیز ذخیرہ پیدا ہو گیا ہے۔

جوشؔ نے کیا برا کیا جو یہ کہہ دیا ؎

جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں وہ آبِ صاف بھی افشردۂ اصنام ہے ساقی

سچ پوچھو تو یہ عبارت اگر گھڑی ہے تو اس میں افسانہ و رسوم و روایات کی اینٹیں چنی ہوئی ہیں۔

ورنہ آدمی سیدھے سادے عمل کی بے کیفی اور سنجیدگی پر صدیاں کیسے گزار سکتا ہے۔ کچھ تو چاہیے ہی بہلانے کی باتیں۔

(نومبر ۴۹ء)

غیب کی زبان | ایسا لگتا ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

صبح کا وقت ہے۔ موجوں سے کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ ہمارا اسٹیمر ساحل سے دور سمندر میں چلا جارہا ہے۔ اتوار کا دن ہے لوگ تفریح کے موڈ میں ہیں۔ سامنے دو چار میل پر جزیرہ نظر آرہا ہے جہاں سارے مسافروں کو اترنا ہے۔

زیادہ تر مسافر اسٹیمر کے اس کنارے پر اکٹھے ہیں۔ پارسی لڑکیاں اپنے بھائیوں اور عاشقوں سے چہلیں کر رہی ہیں۔ کچھ لوگ ان کی خوش وقتی کو دیکھ رہے ہیں کچھ ہیں جو دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں۔
میں اسٹیمر کے دوسرے گوشے میں چلا آیا۔ جہاں انجن سے کئی بڑے بڑے رسّے بندھے ہوئے ہیں اور موجوں سے کھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

غلام احمد خاں آرزو کو فارسی کے بہت شعر یاد ہیں۔ انھوں نے بُش شرٹ کی جیبوں میں بے فکری سے ہاتھوں کے کفگیر ٹانگ دئے۔ اور کئی شعر اگلے۔
مجھے بے سبب وہ حافظ کی غزل یاد آئی۔

دِل می رَود ز دستم صاحبدلاں خدارا   دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

میں نے ساری وضعداریاں پرانے کوٹ کے ساتھ اتار کر ایک طرف ڈال دیں اور خوب چٹکیاں بجا بجا کر اور لہک لہک کر ایک ایک شعر اس غزل کا پڑھا۔ آس پاس کے کئی باذوق آدمی حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ سب جھومنے لگے۔

اتنے میں کسی نے کہا" چلو بس تیار ہو جاؤ۔ جہاز آگے نہیں جائے گا کشتیوں میں کنارے چلنا ہے"
میں نے کہا" یارو۔ جانا نہیں۔ دو شعر اور ہیں ابھی"
دوسرا شعر میں اٹھا ہی رہا تھا کہ کشتی آئی اور اسٹیمر کے گلے میں باہیں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ کئی خوش باش نوجوانوں نے اپنے اپنے دوستوں کو بازو کا سہارا دے کر اسٹیمر سے کشتی میں اتار دیا۔ اور خود لنگوٹ کس کر سمندر میں کود پڑے کہ کشتی سے پہلے تیر کر کنارے پر پہنچ جائیں اور وہاں اپنے رفیقوں کا انتظار کریں۔

"ہاں وہ شعر

کشتی شکستگانیم۔اے بادِ شرط برخیز۔ اے بادِ شرط برخیز۔ اے بادِ شرط برخیز

کئی آوازوں نے میرا ساتھ دیا۔

ایک نوجوان جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی شاید اسی شعر کے انتظار میں رکا ہوا تھا۔

وہ تیراکی کے لباس میں مستعد کھڑا تھا۔ اس نے اُچک اُچک کر اس مصرعے کا مزا لیا۔

اور یک بارگی سمندر میں کود گیا۔ کنارے پر ہم سے پہلے پہنچنے کے لئے۔

اور لوگ بھی تیرتے ہوئے بڑھ رہے تھے کسی کو ادھر توجہ نہ ہوئی۔

ہم نے آخری شعر بلند کیا

کشتی شکستگانیم اے بادِ شُرط برخیز شاید کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

اے بادِ شُرط برخیز

کشتی شکستگانیم

"دوڑو دوڑو ..... ہائے وہ ڈوبا" کئی آوازیں پشت سے ایک ساتھ بلند ہوئیں "لطیف ارے لطیف کو بچاؤ"

اسٹیمر آگے جا نہیں سکتا تھا۔ کشتی میں پہلے سے ہی نازک اندامانِ کالج لدے ہوتے تھے وہ بھی ڈول کر رہ گئی۔ کنارے سے لوگ چلاتے۔ جہاز پر سے "یارانِ آشنا" نے صدائیں بلند کیں مگر کوئی اسے نہ بچا سکا۔ وہ گرداب میں پھنس کر گم ہوگیا۔ کسی نے مجھ سے کہا "بعض بعض زبان بھی بڑی زہریلی ہوتی ہے۔ اور بُری فال منہ سے نکالو"

میں دبی آواز سے سارے دن وہی شعر گنگناتا رہا۔

واپسی کے وقت شام کو ہم سب نے اس کی لاش دیکھی جو کنارے آلگی تھی۔ مرنے والے کے کئی دوست اسے حیرت و غم کے ساتھ دیکھتے رہ گئے۔

شاید کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

سطح اور تہہ | سیپیاں اپنے بطن میں قطرے لے کر
سمندر کی تہہ میں چلی جاتی ہیں اور موتی اگلنے میں لگی رہتی ہیں۔
شیرنی خوراک کا حصہ دبوچ کر
گھنے کچھار میں چلے جاتے ہیں اور اسے ہضم کر لینے تک نہیں نکلتے
مردانِ خردمند اپنا اپنا مشن لے کر
عمل گاہوں میں، کتب خانوں میں، ٹریڈ یونینوں میں اور انجانے مقامات میں
کھو جاتے ہیں اور کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ عمل پیہم اور یقین محکم کے متوالے۔ انسانیت
کو ایک منزل آگے تک لے جانے کے لئے کتنی راتوں کو صبح کر چکے ہیں۔
کتنی چلچلاتی دوپہروں کو سردی کے کہرے میں بدل چکے ہیں۔
کتنے مصائب خود ان کے سر سے گذر گئے اور انھیں خبر نہ ہوئی۔

لیکن میرے بھائی، زرا ان تنکوں کی دیدہ دلیری کو تو دیکھو
کہ سمندر کی موجوں کی سطح پر بہے چلے جاتے ہیں۔
زرا اس بے مایہ جھاڑ جھنکاڑ کی تشہیر پسندی تو دیکھو
جو آندھی کے جھونکوں کے آگے اڑا پھرتا ہے
——— اور ان خوشنما چھلکوں کو دیکھو
جو خود تو مغز سے بے بہرہ ہیں مگر مغز پر چھائے رہتے ہیں۔

ہائے یہ صرف اسٹیج پر گرجنے والے۔

(۶ر دسمبر ۵۱ء)

ماں کا دل | دل اور عقل میں فرق کرنا

ابن آدم نے پہلی بار ماں کے دل سے سیکھا ہوگا

ماں کا دل محض دھڑکنے والا دل ہے۔

کوئی دل عقل کے اثر سے آزاد نہیں۔

عاشق جاں باز کا دل بھی

ایک بار سوچ بچار میں پڑ جاتا ہے۔

اگرچہ اس سے انکار بھی ضرور کرتا ہے۔

لیکن ماں کا دل

صرف ایک سادہ اور سچا دل ہے۔

جو محبت کے سب سے پہلے خمیر سے تیار ہوا ہے۔

ماں کا دل اتھاہ سمندر ہے۔

سمندر کے بھی کنارے ہوتے ہیں۔

مگر ماں کے اس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں۔

ماں کا دل محبت کا خزینہ ہے۔

جہاں تمام محبتوں کی حدیں ختم ہوتی ہیں۔

وہاں سے ماں کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

بلکہ سچ پوچھو تو۔

وہ نہ کہیں سے شروع ہوتی ہے، نہ کہیں ختم ہوتی ہے۔

سورج کی طرح

ماں کا دل ہی اس نور کا سرچشمہ ہے۔

ماں کا دل ہی اس کی آخری بلندی ہے۔

اور ماں کا دل ہی اس کا آخری نشیب بھی ہے۔

(۲۹ جولائی ۴۸ء)

غلامانِ اسلام

اسّی کے قریب ان صحابہ تابعین، تبع تابعین، فقہا اور محدثین اور اربابِ کشف و کرامات اور اصحابِ علم و ادب کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و تدقیق سے جمع کئے گئے ہیں جنہوں نے غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود ملّت کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں جنہیں اسلامی سوسائٹی کے ہر دور میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور سماجی کارنامے اس قدر شاندار اور اس قدر روشن ہیں کہ ان کی غلامی پر آزادی کو رشک کرنے کا حق ہے اور بجا ہے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی محققانہ دلچسپ اور معلومات سے بھرپور کتاب اس موضوع پر اب تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی اس کے مطالعہ سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز اور شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ دوسرا ایڈیشن صفحات ۴۸۸ بڑی تقطیع قیمت پانچ روپیہ ۸ مجلد ہے